The Journal of Arts, Sociology and Humanities
The JASH, Vol. 3 No. 2 (2025). Homepage: https://thejash.org.pk/index.php/jash

تبصرہء کتب

ناول خواب انگارے کا موضوعاتی مطالعہ

اقدس ہاشمی*

ناول اردو ادب کی مقبول ترین نثری صنف ہے ۔نثر میں موضوع کے لحاظ سے ناول کو بہت زیادہ پسند کیا گیا۔فکشن میں ناول زندگی کی پیچیدگیوں ،ناہمواریوں اور معاشرے کی سفاکیت کی حقیقی تصاویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے ۔ناول ایک ایسی صنف ہے جو زندگی کا خلا صہ بیان کرتی ہے ۔اردو ادب میں اس صنف کا دخول انگریزی فکشن سے ہوا ۔اس صنف نے داستان سے سفر شروع کیا اور ناول اسی سفر کی ایک حسین کڑی ہے ۔اس لئے یہ لفظ ناول اطالوی زبان کے "ناو یلا " سے نکلا ہے جس کے معنی عجیب یا انوکھا ہیں ۔

ناول کا شمار بیانیہ نثر میں کیا جاتا ہے جیسا کہ داستان بھی بیا نیہ نثری ہے لیکن ناول کو داستان سے الگ کرنے والی چیز یہ ہے کہ اس میں زندگی کی حقیقتوں اور اس کے فلسفے کو واضح کیا جاتا ہے ۔ناول کی تعریف کرتے ہوئے عظیم الشان صدیقی کچھ یوں لکھتے ہیں کہ :

> زندگی میں نئی معنویت کی جستجو اور نئے رشتوں اور اقدار کی تلاش نیز جذبۂ تعمیر و تشکیل کا زیادہ جامع اور مکمل اظہار بیانیہ نثر ہی میں ممکن تھا۔چنانچہ ان مقاصد کے حصول اور حقیقی زندگی کی عکاسی کے لئے بیانیہ نثر سے بھی کام لیا جانے لگا،تو روایتی بیانیہ نثر ،قصوں اور داستانوں سے ممتاز کرنے کے لئے اس طرح کے نثر پاروں کو ناول کے نام سے پکارا گیا۔ (1)

جیسا کہ ناول کا شمار بیانیہ نثر میں کیا جاتا ہے تو اس اعتبار سے ناول کی کئی اقسام بھی وجود میں آئی ہیں ۔کیونکہ ناول نگار زندگی کے حقائق اور دیگر واقعات کو موضوع بناتا ہے ۔اس میں اصلاحی ،معاشرتی،معاشی،سیاسی،نظریاتی،جاسوسی،تاریخی اور موضوعاتی ناول لکھے جانے لگے ۔ہمارا موضوع بھی آج کے دور کا ایک ایسا ہی ناول ہے جس کا شمار موضوعاتی اور سیاسی حوالے

*اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد
ای میل: aqdas.phdmc47@iiu.student.edu.pk

سے ہوتا ہے ۔یہ تحقیقی مقالہ ناول خواب انگارےکے موضوعاتی جائزے پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اس ناول میں بہت خوبصورتی سے متنوع موضوعات کو کہانی کا حصہ بنایا ہے ۔

خواب انگارےکے مصنف نعیم بیگ کا شمار آج کے اردو فکشن کے ممتاز مصنفین میں ہوتا ہے ۔انہوں نے ناول اور افسانہ میں اپنا لوہا منوایا ہے ۔نعیم بیگ مارچ 1952 ء لاہور میں پیدا ہوئے ۔انہوں نے لاہور اور گوجرانولہ سے تعلیم حاصل کی ۔اس کے بعد بلوچستان یونیورسٹی سے گریجویشن اور قانون کی ڈگری حاصل کی ۔آپ شعبے کے اعتبار سے بینکاری اور انجینئرنگ مینیجمینٹ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اردو ادب سے گہرا لگاؤ ہونے کی وجہ سے بہ حیثیت ایک فکشن نگار آپ نے شہرت حاصل کی ۔انہوں نے اردو اورانگریزی زبان میں ناول اور افسانے لکھے ۔انگریزی زبان میں انہوں نے "گولن پلان "اور"ٹرینگ سول "کے نام سے دو ناول لکھے ۔اس کے بعد ان کے اردو ناول "ڈیوس،علی اور دیا "نے ادبی حلقوں میں پزیرائی حاصل کی۔ وہ ناول کے علاؤہ افسانہ میں بھی اپنے کمال فن کو منوا چکے ہیں ۔ان کاا فسانوی مجموعہ "یو ڈیم ۔سالا"بہت مشہورہے۔اس کے بعد دوسرے افسانوی مجموعے " پیچھا کرتی آوازیں"نے اردو افسانہ میں ان کا نام اور بھی بڑا کردیا۔ آپ نے اپنی تحریروں کے ذریعے جدید زندگی کے پیچیدہ مسائل اور انسانی تجربات کو نہایت گہرائی اور مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔نعیم بیگ کی کہانیوں اور ناولوں کی ایک خاص بات ان کا حقیقت پسندانہ انداز ہے، جو قارئین کو زندگی کے قریب تر لے جاتا ہے۔ ان کے کردار زندگی کے اصل رنگوں میں رنگے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، اور ان کے مکالمے انسانی جذبات اور احساسات کے عکاس ہیں۔

نعیم بیگ نے اردو ناول میں پہلے تاریخی اور سیاسی ،سماجی اور ملک کے معاشی مسائل کو موضوع بنایا تھا اور اس کے بعد اپنے دوسرے ناول خواب انگارے میں بلوچستان کی پسماندگی اور یہاں کی سیاسی ،سماجی ،معاشی اور معاشرتی زندگی کو ایک خوب صورت کہانی میں ڈھال کے پیش کیا ہے ۔اس ناول کی کہانی متنوع موضوعات پر مشتمل ہے، اور اس مقالے کا محور انہی موضوعات کا تجزیہ ہے۔ناول کے ذریعے کسی خطے کی تاریخ کو کہانی کی صورت میں پیش کرنا ایک پیچیدہ عمل ہے، لیکن تاریخ کی دلچسپی اسے ایک منفرد اور پرکشش موضوع بنا دیتی ہے۔اس ضمن میں علی احمد فاطمی لکھتے ہیں :

> انسان کو ہمیشہ تاریخ سے دلچسپی رہی ہے ۔ماضی کے گزرے ہوئے لمحے اور اس کی یادیں نہ صرف ایک رومان پرور ماحول اور خوشگوارفضا میں لے جاتی ہیں بلکہ ایک صحت مند فکر اور زندگی رہنے کی قوت بخشتی ہیں ۔ (2)

خواب انگارے میں بلوچستان کی سیاسی تاریخ کے ساتھ اور بھی موضوعات کو اٹھا یا گیاہے جیسا کہ محبت اور قربانی ،انسانی خوابوں کی حقیقت اس کے علاوہ سماجی اور معاشی مسائل اور یہاں کے لوگوں کی تمدنی زندگی ،ان کے رہن سہن، ان کے رویے، ایک دوسرے کے ساتھ میل جول اور باہر سے آئے مہمانوں کی آمد پر مقامی لوگوں کے تاثرات وغیرہ ۔ ناول کے آغاز میں مصنف نے ایک گہرا اور پُرتاثیر ماحول تخلیق کیا، جو قاری کو ابتدائی سطروں سے ہی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اختتام تک اس کی شدت برقرار رہتی ہے، یوں کہانی کا تاثر ہر مرحلے پر مزید گہرا ہوتا جاتا ہے۔اس کہانی میں مصنف نے کرداروں کو ایک ساتھ لاتے ہوئے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بخوبی پیش کیا، جس سے کہانی میں گہرائی اور پیچیدگی آتی ہے اور قاری کو محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ بلوچستان کی ایک مکمل کہانی بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ علاقہ کیسے اپنے ملک کے باقی علاقوں سے ترقی کی راہ میں پیچھے رہ گیا ہے ۔اس خطے کے ساتھ کیسا کیسا سلوک برتا گیا اور کون کون سے سیاسی پروپیگنڈے اس میں شامل ہیں۔ یہ سب نعیم بیگ نے بہت دھیمے اور پر اثر لہجے میں کہانی میں بیان کر دیا ہے ۔کرداروں میں مرکزی کردار تو سروپ،ریکا اور صبا کا ہی ہے لیکن ان کے ساتھ کئی ضمنی کردار بھی سامنے آئے ہیں جو اس کہانی کو مکمل کرنے میں اپنا بھرپور حصہ ڈالتے ہیں جن میں پروفیسر جمالدینی،شہناز بلوچ ،وادی خان بلوچ،ڈاکٹر محبوب،اور کینٹ وغیرہ شامل ہیں ۔

اس ناول میں نعیم بیگ نے بلوچستان کے سیاسی محرکات کو موضوع بنایا ہے جن کو کرداروں کے مکالمات کے ذریعے ایسے قاری کے سامنے رکھا ہے جیسے کہ قاری خود اس خطے میں موجود ہے اور ان تمام محرکات کا حصہ ہے ۔سیاسی صورتحال کے بارے میں ناول سے اقتباس ملاحظہ کیجیے :

> یوں تو پاکستان کی تاریخ میں کئی ایک حوالوں سے بشمول بم دھماکوں کے اکتوبر اوردسمبرکا مہینہ ہمیشہ اہم رہا ہے لیکن اس بار جولائی 2010ء بیک وقت پاکستان اور سروپ بلوچ کے خاندان پر بھاری تھاپنجاب کے دارلحکومت پر ساون بھادوں کیا آئی پورے ملک کو سوگوار کر گئی ۔تین روز قبل داتا دربار پر ہونے والے خوفناک دوبم دھماکوں نے پورے ملک کی فضا کو سوگوار کردیا تھاپچاس کے قریب لوگ ہلاک ہو چکے تھے ۔ (3)

اوپر دئیے گئے اقتباس میں بلوچستان کی سیاسی تاریخ اور ملک میں ہونے والے سیاسی پروپیگنڈوں کو موضوع بنایا گیا ہے ۔مصنف نے بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے ان معاملات کو پیش کیا ہے ۔اس ناول میں بلوچستان کی آزادی کی جو تحریک چل رہی اس کا تمام ترپس منظر پیش کیا گیا ہے ۔بظاہر تو بلوچستان پاکستان کا جغرافیائی طور پر سب سے بڑا صوبہ ہے لیکن آبادی کم ہے ۔اس

لئے جب ملک میں مالی بجٹ تیار کیا جاتا ہے تو آبادی کم ہونے کی بنا پر اس صوبے کے حصہ میں مالی بجٹ کم آتا ہے کیونکہ صوبوں میں جو رقم دی جاتی ہے وہ آبادی کے تناسب سے ہی متعین کی جاتی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ اس صوبے کو گرانٹ اس کی آبادی کے مطابق دی جاتی ہے جو اسے کم پڑ جاتی ہے اس علاقے کے وسائل پورے نہیں ہو پاتے اور یہ علاوہ آگے ترقی کرنے سے محروم رہ جاتا ہے ۔ویسے بھی جس صوبے میں آبادی زیادہ ہو ، حکومت اسے ہی فوقیت دیتی ہے ۔

ملکی سیاسی محرکات بلوچستان کے لوگوں کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ اپنے لئے الگ سے کوئی حکومت بنائیں اس کے ساتھ بلوچستان کے رہنے والوں کی نفسیاتی صورتحال بھی باقی پاکستان کے لوگوں سے خاصی الگ ہے جس کا تذکرہ اس ناول میں بھی کیا گیا ہے ۔مصنف لکھتے ہیں :

> یہاں کی آب وہوا سرد اور خشک ہے جس سے مقامی لوگوں میں بلا امتیاز نسل و رنگ موسمی اثرات بڑی قوت کے ساتھ ابھر آتے ہیں ۔تعلیم کی کمی ،پہاڑوں کی لامتناہی طویل دشوار گزار راستے اور درے،بیشتر حصوں میں ہمیشہ کی خشک سالی ،اشیاء خوردونوش اور پانی کی کمی نے مقامیوں کی نفسیات میں زندگی کے ایک انداز چھین لئے ہیں ۔بظا ہر وہ بحیثیت عام شخص قدرے کھردرے اور سخت جان ہیں ،لیکن۔ باطنی طور پر اخلاقیات کا مرکب ہیں ۔بہترین سماجی اخلاق اور فطری آزادی اور اچھائی ان کی جبلت میں پنہاں ہے ۔ (4)

یہاں مصنف نے یہ واضح کر دیا ہے کہ بلوچستان کے رہنے والے فطری طور پر سخت جان اور مزاجاً تلخ ہوتے ہی۔ کیونکہ ان کا پہاڑی علاقہ انہیں ایسا بنا دیتا ہے ۔خود جو وہ دوسروں سے الگ تصور کرتے ہیں اس لئے خود کے لئے ایک علیحدہ تشخص کے دعویدار نظر آتے ہیں ۔سرد اور خشک آب و ہوا، دشوار گزار راستے، خشک سالی، اور دیگر قدرتی مشکلات نے مقامی لوگوں کی زندگیوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ان حالات نے ان کی شخصیت کو ایک خاص نوعیت دی ہے، جس کا ظاہری اثر ان کی سخت اور کھردری طبیعت میں دکھائی دیتا ہے۔ تاہم، اس کے باوجود ان کی باطنی صفات میں اخلاقیات، سماجی ذمہ داری، فطری آزادی اور اچھائی چھپی ہوئی ہے، جو ان کی جبلت کا حصہ ہیں۔ یہ بیان انسانی نفسیات کے پیچیدہ پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے، جہاں فرد کے بیرونی رویے اور داخلی صفات کے درمیان تضاد موجود ہوتا ہے۔ انسان اپنی مادی اور قدرتی حالتوں سے متاثر ہو سکتا ہے، لیکن اس کی اصل فطرت میں اخلاقی اقدار اور اچھائی کی جبلت ہمیشہ موجود رہتی ہے۔

اس ناول کو پڑھ کر بظاہر یہی لگتا ہے کہ یہ صرف بلوچستان کے خطے کی تاریخ اور سیاسی پروپیگنڈا کی کہانی ہے لیکن اس میں ساتھ ساتھ انسانی رویوں لہجوں اور ان کی نفسیات کو بھی

موضوع بنایا گیا ہے ۔مصنف نے جہاں بلوچوں کے مردانہ جاہ و جلال کی بات کی ہے وہیں ساتھ ہی عورت کی زندگی کو بھی موضوع بنایا ہے ۔عورت کی زندگی کے متعلق لکھتے ہیں :

یہ پاکستان ہے ۔تم جانتے ہو یہاں عورت ایک کمزور استعارہ ہے ۔تو
کیا ہوا یہاں عورت ساری عمر ہی کمزور رہی ہے ------------------یہاں
بہنیں ہمیشہ بھائیوں کی خواہشوں پر قربان ہوئی ہیں - (5)

یہاں پر مصنف نے عورت کی حیثیت کو ایک سماجی اور ثقافتی تناظر میں پیش کیا ہے، جہاں عورت کو محض ایک "کمزور استعارہ" کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس جملے کا مقصد عورت کی کمزوری کو ظاہر کرنا نہیں بلکہ اس کے وجود کو محض ایک علامت کے طور پر دیکھنا ہے، جو ہمیشہ مردوں کی خواہشات اور فیصلوں کے تابع رہی ہے۔مصنف نے اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ پاکستان جیسے معاشرتی سیاق و سباق میں عورت کو اکثر کمزور اور تابع سمجھا جاتا ہے، اور یہ صرف ایک عارضی حقیقت نہیں بلکہ ایک طویل روایتی صورتحال ہے جس میں عورت کی آزادی اور حقوق اکثر نظرانداز کیے جاتے ہیں۔ "یہاں بہنیں ہمیشہ بھائیوں کی خواہشوں پر قربان ہوئی ہیں" میں مصنف نے اس بات کو بیان کیا ہے کہ عورت کے حقوق اور فیصلہ سازی کی آزادی ہمیشہ خاندان اور معاشرتی روایتوں کے تحت محدود رہی ہے، جہاں اس کی حیثیت ایک "قربانی" کے طور پر دیکھے جانے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔دریں اثناء پاکستانی معاشرے پر گہرا طنز کیا گیا ہے کہ یہاں عورت چاہے بلوچستان کے پہاڑی سخت جان کھردرے علاقے سے ہی کیوں نہ تعلق رکھتی ہو اسے کمزور ہی تصور کیا جاتا ہے ۔اس کہانی میں صبا اور ریکا دو ایسے کردار موجود ہیں جو عورت کی مضبوطی کو ظاہر کرتے ہیں اور ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کے لئے تیار نظر آتے ہیں ۔ان کرداروں نے عورت کو گھر کی چار دیواری سے باہر نکالا ہے اور اس بات کو منوایا ہے کہ عورت مرد سکے مدِمقابل کھڑی ہے جب اس کے ملک ، علاقے اور خاص کر اس کے خاندان پر کوئی آنچ آ ئے تو یہ بھی مردوں کی طرح ڈٹ کر مقابلہ کر سکتی ہے اور اپنی جان تک کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرے گی ۔اسی طرح اس ناول میں مصنف نے محبت اور قربانی کو بھی موضوع بنایا ہے ۔اب یہ قربانی ایک مرد عورت کی محبت کی قربانی بھی ہو سکتی ہے کہ یہاں ریکا سروپ کی محبت میں اپنے ملک کی محبت کو قربان کر رہی ہے دوسری طرف سروپ اپنے لوگوں کی محبت میں اپنے آنے والے بہترین اور چمکدار مستقبل کو داؤ پر لگا رہا ہے ۔صبا بھی اپنی ماں کی قربانی کو ضائع نہیں ہونے دے گی اس کے لئے چاہے اسے کسی بھی حد تک جانا پڑے ۔ان تمام کرداروں میں قربانی کا جذبہ دکھایا گیا ہے چاہے وہ کسی بھی صورت میں ہو ۔ناول کے اختتام پر مصنف نے محبت اور قربانی پر چند جملے ایسے لکھے ہیں جو قاری کے دل و دماغ پر بھرپور اثر ڈالتے ہیں۔یہ جملے ملاحظہ کریں:

> ۔اچھا۔۔اچھا۔۔۔مرکیوں رہے مان لیا وہ تمہاری ہیروئن تھی ،لیکن تم نے تو اسے رات کے گھپ اندھیرے میں مار دیا۔ہاں اس پر ظلم ہوا لیکن اس ظلم اور جبر کے بطن سے صبا جیسی کئی لڑکیاں وہاں پیدا ہونگی ،جو علم کی شمع ہاتھ میں لئے صبا کا مشن جاری رکھیں گی ۔لیکن تم ریکا کو دیکھو کس قدر سخت حالات میں اس کا ساتھ دے رہی ہے ۔وہ خود منی کلچرل ونگ میں رہ کر اس بلوچ لڑکے کو ۔۔۔چلو لمحہ بھر کو اسے تمہارا ہیرو مان لیتے ہیں ۔وہ اس لڑکے کو اس کے اپنے لوگوں کا نجات دہندہ بنانا چاہتی ہے ۔وہ چاہتی ہے کہ وہ سب کچھ جو وہ یہاں سپین میں حاصل کر چکا ہے ۔اپنے ملک میں جاکر اپنے لوگوں میں محبت،پیاراور آزادی کا پیامبر بنے۔ (6)

یہاں پر مصنف نے کئی اہم موضوعات اور کرداروں کی نفسیات کو بہت گہرائی سے پیش کیا ہے، جس سے کہانی کی سماجی اور ثقافتی نوعیت ظاہر ہوتی ہےپہلے حصے میں، "اچھا۔۔اچھا۔۔مرکیوں رہے مان لیا وہ تمہاری ہیروئن تھی، لیکن تم نے تو اسے رات کے گھپ اندھیرے میں مار دیا" میں مصنف نے اس بات کا اشارہ کیا ہے کہ صبا ایک اہم اور مثالی کردار تھی، لیکن اس کا قتل ایک تلخ حقیقت ہے۔ یہاں "ظلم اور جبر" کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ معاشرتی بے انصافی اور ظلم کا نتیجہ تھا۔ تاہم، اس کے باوجود مصنف نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ اس ظلم کے باوجود اس کی قربانی سے نئی نسلیں پروان چڑھیں گی جو اس کے مشن کو آگے بڑھائیں گی۔ صبا کی طرح کئی لڑکیاں علم کی شمع اٹھائے اپنی جدوجہد کو جاری رکھیں گی، اور اس کے خوابوں کو حقیقت میں تبدیل کرنے کی کوشش کریں گی۔دوسرے حصے میں "لیکن تم ریکا کو دیکھو" میں مصنف نے ریکا کے کردار کو اجاگر کیا ہے، جو نہ صرف خود کو منی کلچرل ونگ میں شامل کر کے بلوچ لڑکے کی مدد کر رہی ہے، بلکہ اس کی زندگی کے مقصد کو سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ کھڑی ہے۔ ریکا کا کردار اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ وہ اس بلوچ لڑکے کو نجات دہندہ بنانے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ وہ اپنے لوگوں میں محبت، آزادی اور بہتر مستقبل کی امید پیدا کر سکے۔

اس ناول میں مصنف نے قربانی اور محبت کے جذبات کی بھرپور عکاسی کی ہے اوپر دی گئی سطور میں ہی اس موضوع کو واضح کر دیا گیا ہے ۔مصنف نے بڑے عمدہ انداز میں کہانی اور کرداروں کو آپس میں ملایا ہے اور پھر انہیں جدا بھی بڑے سلیقے سے کیا ہے ۔مصنف نے اپنے کرداروں کے متعلق آخر میں خود سے کلام کرتے ہوئے بولا ہے کہ یہ ایسے کردار ہیں جنہیں تم نے قربان کرنا ہی ہے ان کی قربانی ہے تمہاری کہانی کو زندہ رکھے گی ورنہ تمہاری کہانی بے جان اور بے قوت ہو جائے گی ۔مصنف کے اس انداز نے کہانی کو ایک اور موضوع دے دیا ۔کہانی کارکا خود

سے کلام کرنا اور پھر اپنے کرداروں کی اہمیت وافادیت کو بھرپور طریقے سے اجاگر کرنا ۔اردو ناول میں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں ۔مصنف کا خود کلامی کا ایک انداز ملاحظہ کریں:

> میں خالق ہوں ان کرداروں کا ،کیسے انھیں بے یارو مددگار مرنے دے سکتا ہوں ۔وہ صرف اس کی بے بس ساتھی ہی نہیں،میری ہیروئین ہے ۔اس کہانی کی ہیروئن ہے ۔اسی کے نام پرتو کہانی لکھی جا رہی ہے ۔میں بس یہ کرہا ہوں کہ فیصلہ تم سب پر چھوڑ رہا ہوں ۔میں چلایا ۔(7)

ناول میں اس مقام پر مصنف کا خود کلامی کا انداز نہ صرف کہانی کی نوعیت کو مزید پیچیدہ اور گہرا کرتا ہے، بلکہ یہ اس کی تخلیقی آزادی اور ادبی حکمت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ جب مصنف اپنے کرداروں کے متعلق کہتا ہے کہ "یہ ایسے کردار ہیں جنہیں تم نے قربان کرنا ہی ہے"، تو وہ اس بات کو تسلیم کر رہا ہے کہ ان کرداروں کی قربانی ناگزیر ہے تاکہ کہانی میں جذبہ اور شدت پیدا ہو سکے۔ کرداروں کی قربانی، ان کی مشکلات اور ان کی جدوجہد ہی کہانی کی طاقت اور حقیقت کو زندہ رکھتی ہے۔یہ خود کلامی کا انداز ایک جدید اور منفرد تکنیک ہے جو اردو ناول میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مصنف یہاں اپنی تخلیقی حیثیت اور کہانی کے تانے بانے پر اپنی قدرت کا مظاہرہ کر رہا ہے ، اور اس کے ذریعے وہ قاری کو بتاتا ہے کہ اس کی تخلیق کردہ دنیا اور کرداروں کی تقدیر صرف اس کے ہاتھ میں ہے۔ "میں خالق ہوں ان کرداروں کا" میں مصنف اپنے کرداروں کی تخلیق کے بارے میں نہ صرف خود اعتمادی ظاہر کرتا ہے بلکہ اس کا یہ بھی اشارہ ہے کہ اس نے ان کرداروں کو زندگی دی ہے اور ان کی تقدیر بھی اس کے تخلیقی ہاتھوں میں ہے۔''وہ صرف اس کی بے بس ساتھی ہی نہیں، میری ہیروئین ہے" میں وہ اپنے کردار کو اہمیت دے رہا ہے، اور اس کا کہنا ہے کہ کہانی کی اصل ہیروئین وہ ہے جو اس کے تخلیق کردہ دنیا کا محور ہے، اور اس کے بغیر کہانی ادھوری اور بے جان ہو جائے گی۔ اس جملے میں مصنف اس بات پر زور دیتا ہے کہ اس کی کہانی کی اصل قوت کرداروں میں ہے، اور ان کے فیصلوں اور قربانیوں کے بغیر کہانی کی روح غائب ہو جائے گی۔

یہ خود کلامی کا انداز ایک خاص نوعیت کی ادبی تکنیک ہے، جس میں مصنف براہ راست قاری سے بات کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے، اور اس طرح وہ اپنے کرداروں کی اہمیت اور کہانی کے اجزائ کو مزید تقویت دیتا ہے۔ اس سے ناول میں ایک نئی جہت آتی ہے، جہاں مصنف نہ صرف ایک تخلیق کار بلکہ ایک ہدایتکار کی طرح کہانی کے واقعات اور کرداروں کی تقدیر کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتا ہے۔یہاں مصنف نے خود کاو بہت بے بس اور لاچار پایا ہے وہ چاہتا ہے کہ اپنی کہانی کے کرداروں کو اپنے حساب سے چلائے کیوں کہ یہ اسی کے بنائے گئے کردار ہیں لیکن اب کردار

اس کے نہیں رہے وہ کہانی کا حصہ بن گئے ہیں اور اب وہ مجبور ہے ان کرداروں کو ویسے ہی پیش کرے جیسے کہانی کی مانگ ہے جس سے کہانی آگے بڑھے اور اس کے کردار محبت اور قربانی کی کشمکش میں الجھے ہوئے ہیں ۔اسی طرح اب مصنف بھی خود کو بے بس قرار دے دیتا ہے اور کہانی کو قاری پر چھوڑ دیتا ہے ۔اس کہانی میں مصنف نے اپنے ایک اور کردار کو قربان ہوتے دیکھا ہے ۔ یہ صورتحال ملاحظہ کریں:

> وہ بھی میری ہیروئین ہے۔میری آدرشوں کی گٹھری ،جو خود کو انسان ثابت کرنے کے لئے انگاروں پر چل رہی تھی۔۔۔۔دیکھو!کیسے کج رو معاشرے میں سچ کے دیپ جلا رہی تھی ۔صحراؤں میں بھٹک رہی تھی۔وہ مجھ سے بھلا کیا چاہتی ہوگی ۔ایک کہانی کار اسے دے بھی کیا سکتا ہے ۔فقط فہم و ادراک کی دنیا،جو اس کے باطن کو بدل دے ۔یہی تو وہ خود کرہی رہی تھی۔ (8)

اس مقام پر مصنف کا خود کلامی کا انداز اور کرداروں کے ساتھ اس کی گہری جذباتی وابستگی اور ان کی تقدیر پر اس کا غم و افسوس واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ مصنف نے اس کردار کو "ہیروئین" کے طور پر پیش کیا ہے، جو اپنے آدرشوں اور خوابوں کے ساتھ ایک انتہائی مشکل اور بے رحم معاشرتی ماحول میں اپنے آپ کو ثابت کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ "انگاروں پر چل رہی تھی" کا مطلب ہے کہ وہ شدید مشکلات اور مصائب کا سامنا کر رہی تھی، پھر بھی اپنے اصولوں اور سچائی کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔’’کج رو معاشرے میں سچ کے دیپ جلا رہی تھی" میں مصنف اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ کردار ایک غیر منصفانہ اور بگڑے ہوئے معاشرتی نظام میں سچائی کے چراغ روشن کر رہا تھا، جو کہ کسی بھی معاشرتی تبدیلی کے لیے ایک جرات مندانہ قدم تھا۔ اس کے باوجود، مصنف خود کو بے بس محسوس کرتا ہے اور اپنی حیثیت کو کمزور پاتا ہے کیونکہ وہ اس کردار کی تقدیر کو تبدیل کرنے میں بے اختیار ہے۔’’وہ مجھ سے بھلا کیا چاہتی ہوگی" میں مصنف اس کردار کے لیے اپنی معصومیت اور بے بسی کا اعتراف کر رہا ہے، جہاں وہ خود کو اس کردار کی مدد کے قابل نہیں پاتا۔ تاہم، اس جملے کے آخر میں "فہم و ادراک کی دنیا، جو اس کے باطن کو بدل دے" میں مصنف اس کردار کی ذہنی و فکری قوت کو تسلیم کرتا ہے، جو وہ خود اپنے اندر پیدا کر رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کردار اپنی اندرونی قوت اور سمجھ بوجھ کے ذریعے اپنے حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہا تھا، اور وہ یہ سب خود کر رہا تھا، جس میں مصنف کا کوئی کردار نہیں تھا۔مصنف کا یہ بیان دراصل ایک گہری نفسیاتی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے، جہاں مصنف اپنے کرداروں کو صرف تخلیق نہیں کرتا بلکہ ان کی تقدیر اور جدوجہد پر افسوس اور بے بسی کا اظہار بھی کرتا ہے۔ وہ اپنی تخلیقی طاقت کے باوجود کرداروں کو ایک آزاد راہ دکھاتا

ہے اور قاری پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ ان کرداروں کی کہانی کو سمجھیں اور ان کی قربانیوں کو تسلیم کریں۔ اس طرح، مصنف اپنی تخلیق کی آزادی کے ساتھ ساتھ ایک الگ نوعیت کی خود کلامی کا مظاہرہ کرتا ہے، جہاں وہ اپنے کرداروں کی تقدیر کو اپنی کہانی کی حقیقت بنانے کے لیے ان کے ساتھ ایک جذباتی تعلق قائم کرتا ہے۔یہاں مصنف نے کہانی اور کہانی کار دونوں کے تعلق واضح کردیا ہے کہ مصنف کبھی کبھی اپنے اندر کے انسان کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے اپنے کرداروں کو استعمال کرتا ہے ۔پھر کرداروں اور مصنف میں بھی ایک جنگ چھڑ جاتی ہے ۔ان کی اس آپسی جنگ کو مصنف نے بہت ہی عمدہ انداز میں پیش کیا ہے ۔ ایسے ہی مٹی سے محبت کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

> تم جانتے ہی نہیں کہ میں کس قدر شاطرہوں میں نے ہمیشہ اس دھرتی ماں کا مان رکھا ہے۔میں نیمے وہی کیا جو اس دھرتی ماں کا مقدر ہے میں ستر برسوں سی یہی دیکھ رہا ہوں ۔تنگ آکر میں نے ان باغیوں کو ختم کر دیا ہے ۔جس جس نے اس سماج کی خاطر ان بے بس لوگوں کی خاطرات اٹھایا۔میں نے اپنے قلم سے انہیں تہ تیغ کردیا ہے ۔میں یہی کرسکتا ہوں ۔دھرتی ماں کی اصولی تقلید میں میں نے اپنے زمینی خالق کے نقش کو جا لیا ہے ۔اب تم سب جتنا چاہو چیخو۔۔۔۔۔(9)

مصنف نے مٹی سے محبت اور اس کے اصولوں کے حوالے سے ایک پیچیدہ اور متضاد جذبات کی عکاسی کی ہے۔ "دھرتی ماں" کا تصور یہاں ایک علامت کے طور پر سامنے آتا ہے، جو صرف زمین یا مٹی کی حقیقت نہیں بلکہ ایک نظریاتی اور ثقافتی بنیاد بھی ہے۔ مصنف اس کے ذریعے ایک ایسے شخص کی نفسیات اور نظریات کو بیان کر رہا ہے جو اپنی زمین، معاشرتی اصولوں اور روایات کے لیے بے حد وفادار ہے، حتی کہ اس کے لیے وہ اپنی شخصی جذباتیت اور انسانیت کو نظرانداز کرنے تک تیار ہے۔’’میں نے ہمیشہ اس دھرتی ماں کا مان رکھا ہے" میں وہ اپنے کردار کی وفاداری اور مٹی سے محبت کا اظہار کر رہا ہے۔ اس کی محبت اس قدر گہری ہے کہ وہ اسے اپنے اصولوں اور اقدار کی سب سے بڑی بنیاد سمجھتا ہے۔ اس کے بعد جو جملہ آتا ہے "میں نے ہمیشہ اس دھرتی ماں کا مان رکھا ہے"، وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ اپنے سماج میں ہونے والی بے انصافیوں، انحرافات، یا باغیانہ سرگرمیوں کو برداشت نہیں کرتا اور اس کا حل اپنی قلم کی طاقت سے نکالتا ہے۔’’میں نے ان باغیوں کو ختم کر دیا ہے" میں مصنف اپنے کردار کی شدت پسندی کو ظاہر کرتا ہے، جو ان عناصر کے لیے تشویش کا باعث بنتی ہے جو سماج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ ان باغیوں کو "تہ تیغ" کر کے ان کی مخالفت کو ختم کرنے کا عزم رکھتا ہے، تاکہ سماج میں توازن اور نظم قائم رہ سکے۔

ان سطور میں مصنف نے مٹی سے محبت یعنی وطن سے محبت کا برملا اظہار کیا ہے ۔یہ کہانی کے اختتام کے جملے ہیں جن میں مصنف نے خود کلامی کا طرز اپنایا ہے اور خود کلامی بھی اپنے اندر کے انسان سے کر رہا ہے ۔یہ ایسا انداز ہے جو قاری مزید متجسس اور حیران کر دیتا ہے لیکن اپنے گھر اپنے وطن کی محبت کا ایسا اظہار یہ مصنف کا ہی خاصا ہے ۔وطن سے محبت کے ساتھ اپنے خون کے رشتوں سے محبت اور ان کے لئے قربانی بھی اس کہانی کا اہم موضوع رہا ہے ۔بلوچوں کا اپنے خون کے ساتھ وفادار رہنا اور اس کے لئے قربانی دینا ایک اہم خاصا ہے ۔روز اول سے ان کے ہاں یہ خاصیت پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے خونی رشتوں کے تقدس کو قائم رکھتے ہیں ۔اس کہانی میں صبا اور سروپ کی محبت کو دیکھ لیں ۔بہن بھائی کے محبت کی ایک عظیم مثال قائم کی ہے اس کے ساتھ ہی ماں کے ساتھ اس کے بیٹی کی محبت اور عقیدت کو بھی مصنف نے منفرد انداز میں ابھارنے کی کوشش کی ہے ۔ لکھتے ہیں :

> اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہورہی ہے۔ مما کی جدائی نے اسے صدیوں پیچھے تاریخ کے کسی ویران دھارے میں پھینک دیا ہے ۔خاموشی اس کی روح کے اندر اترتی جارہی تھی۔(10)

مصنف نے صبا کے کردار کی نفسیات کو بہت گہرائی سے بیان کیا ہے، جہاں وہ اپنی ماں کی جدائی کے بعد شدید ذہنی اذیت اور ڈپریشن کا شکار ہو رہی ہے۔ "اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہو رہی ہے" میں مصنف نے صبا کی داخلی کیفیات اور اس کی ذہنی حالت کو واضح کیا ہے، جو کہ اس کی ماں کی موت کے بعد ایک شدید اور تلخ اثرات کا شکار ہو چکی ہے۔ یہ جملہ اس بات کا اظہار ہے کہ صبا کے لیے ماں کا فقدان ایک ناقابل برداشت تجربہ بن چکا ہے، جس کا اثر اس کی ذہنی حالت پر پڑ رہا ہے۔''مما کی جدائی نے اسے صدیوں پیچھے تاریخ کے کسی ویران دھارے میں پھینک دیا ہے" میں مصنف نے اس بات کو بیان کیا ہے کہ صبا کا دل اور دماغ اپنی ماں کے ساتھ جڑے ہوئے تھے، اور اس کی جدائی نے اسے ایک ماضی کی طرف دھکیل دیا ہے جہاں وہ احساس تنہائی اور غم کی حالت میں ہے۔ یہ ایک گہرا اور دکھ بھرا تاثر ہے کہ اس کی ماں کے بغیر وہ اپنے آپ کو ایک ویران اور سنسان مقام پر محسوس کرتی ہے، جیسے وہ کسی تاریخی دور میں پھینک دی گئی ہو۔ "خاموشی اس کی روح کے اندر اترتی جارہی تھی" میں مصنف نے صبا کی اندرونی کیفیت کو اور بھی زیادہ شدت سے پیش کیا ہے، جہاں اس کا دل اور دماغ ایسی خاموشی کا شکار ہیں جو نہ صرف اس کی ذہنی حالت بلکہ اس کی روح کو بھی متاثر کر رہی ہے۔ یہاں خاموشی ایک طاقتور علامت کے طور پر پیش کی گئی ہے، جو غم، تنہائی اور مایوسی کی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے۔

ماں سے محبت بیٹی کے دل میں بہت زیادہ ہے اسی لئے تو ماں کی جدائی اس سے برداشت نہیں ہو پاتی اور وہ خود کا اکیلا تصور کرتی ہے کیونکہ اس نے اپنا جیون ساتھی اپنی ماں کو ہی بنا رکھا ہے ماں کے جانے کے بعد اب اسے اپنے اندر باہر صرف تنہائی محسوس ہوتی ہے ۔وہ اپنی ماں سے اس قدر محبت کرتی ہے کہ وہ اپنی ماں کے لئے اس کی خواہش کے لئے اپنی جان تک قربان کر سکتی ہے ۔یہ انسانی فطرت ہے کہ خون کے رشتے اسے جتنا کمزور کرتے ہیں اتنا ہی مضبوط اور بہادر بھی بناتے ہیں ۔ماں اور بیٹی کے جزبات کو مزید یوں ظاہر کیا ہے کہ :

وہ بے اختیار مما پکار اٹھی۔

مما یہ تمہاری پنکسٹر ہے ۔تمہاری پنکسٹر-----

میں ہار رہی ہوں تمہارے بغیر----

تم نے مجھ سے کہا تھا جب میں تمہیں پکاروں گی،تو تم یہیں کہیں آس پاس سے میرے سامنے نکل آؤ گی ۔آج میں تمہیں پکار رہی ہوں ۔تنہائی دور دور تک تاریکی کا حصہ بنی میری روح میں تحلیل ہو رہی ہے ۔مما ----مما--پلیز---کہاں ہو-(11)

یہ ایسے جملے ہیں جو نہ صرف کردار کے جزبات کو ابھارتے ہیں بلکہ خود کہانی کار اور قاری کے جزبات کو بھی متاثر کرتے ہیں یہاں مصنف نے ماں سے بیٹی کی شدید محبت کو ایک فطری انداز میں پیش کیا ہے جسے پڑھنے والا بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے ۔بیٹی کے اس کرب کو دکھ کو تنہائی کو اس ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے کہ منظر لفاظی کسی ڈراما کی طرح دکھائی دینے لگے ہیں ۔ماں اور بیٹی کی محبت ایک فطری عمل ہے جسے مصنف نے بہت عمدہ انداز میں پیش کیا ہے ۔انسانی معاشرے میں ہر بیٹی صبا اور ہر ماں شہناز بلوچ جیسے جزبات کی حامل ہیں ۔

یہ ناول گنتی کے سو صفحات پر مشتمل ہے لیکن کہانی میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے ان میں ایک موضوع خوابوں کا حقیقت میں بدلنا اور خوابوں کا انگارے بننا بھی شامل ہے ۔خواب انسان کی زندگی اہمیت رکھتے ہیں ۔خواب کی بھی کئی قسمیں ہیں کئی خواب انسان خود بناتا ہے پھر ان کی تکمیل کے لئے سرگرداں رہتا ہے ۔کئی خواب ایسے ہیں جو خود بخود انسان کی زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں ۔کچھ خواب انسان کو دوسرے لاگ دکھاتے ہیں اور بعض اوقات انسان اپنے پیاروں کے ادھورے خوابوں میں کو پورا کرنے کی کوشش میں رہتا ہے ۔بہر حال خواب کسی نہ کسی طور پر انسانی زندگی کا حصہ رہتے ہیں ۔جیسے اس کہانی میں خوابوں کا سفر بھی ایسے ہی شروع ہوتا ہے ۔کہانی کا کردار صبا اپنے ماں کے خواب کو پورا کرنے کی کوششیں میں ہے اسے اپنی ماں کی خواہش اتنی ہی عزیز ہے جتنی کہ ماں ہوتی ہے ۔صبا کے یہ جذبات ملاحظہ کریں:

> میں اچھی طرح جانتی ہوں،لیکن ہماری کازنسل کے بہتر معیار زندگی کی ضامن ہے ۔بچیوں کی تعلیم ہی سے معاشرہ اپنی درست بنیاد رکھ پائے گا ۔اب تک تو مزاق ہو رہا تھا، اس ریاست کے ساتھمیری ماں نے اپنی جان دیدی ،میں بھی دے سکتی ہوں لیکن میں پیچھے نہیں ہٹوں گی - (12)

یہاں بھی مصنف نے ایک ایسے خواب کے بارے میں بتایا ہے جس کے پیچھے ایک بہت بڑا مقصد پایا جاتا ہے اور یہ خواب کسی کی انفرادی کیفیت کا مظہر نہیں ہے بلکہ یہ اجتماعی طور پر تعلیم نسواں کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے ۔مگر یہ خواب دیکھتی ماں ہے پھر اسے پورا کرنے میں بیٹی بھی اہم کردار ادا کرتے ہے یہ خواب سمجھ لیں وراثتا آگے بڑھتا ہے ۔اسی طرح خوابوں کے پیچھے انسان بھاگتا رہتا ہے ۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ سوچتا ہے یا جو بھی اپنے کئے اپنے اردگرد لوگوں کے لئے یا کسی بھی معاملے میں کوئی منصوبہ بندی کرتا ہے وہ اس کے دماغ میں رہتا ہے اس کے شعور سے پھر اس کے لاشعور کا حصہ بن جاتا ہے پھر جب انسان سوتا ہے یا جاگتا اسی کے محور میں گردش کرتا رہتا ہے ۔انسان میں اس چیز کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے کہ وہ یہ سورت ہوئے دیکھ رہا تھا یا جاگتے ہوئے کر رہا رہا تھا ۔ایسی ہی ایک مثال ناول کے کردار سروپ کے ہاں بھی ملتی ہے، ملاحظہ کریں :

> -----جونہی وہ سونے کے لئے بستر پر دراز ہوا تو نیند اس کی آنکھوں سے دور جاچکی تھی ---------وہ نیم خوابیدہ سا ذہن لئے کھڑکی کی طرف بڑھا اور باہر کی طرف نکل گیا بہت دورتیز ہواؤں کی یخ بستگی اس کے وجودمیں اترنے لگی ۔اسے محسوس ہوا کہ وجود سے عدم کے سفر میں ہیولوں کا ایک جنگل سامنے کھڑا ہے اس نے سوچا کیا یہ سب لوگ میرے لئے آئے ہیں؟لیکن مجھے کیا کرنا ہے ؟ (13)

یہاں پر مصنف نے سروپ کی ذہنی اور نفسیاتی حالت کو بہت گہرائی سے بیان کیا ہے۔ یہاں سروپ کا ذہنی احوال ایک ایسی کیفیت میں تبدیل ہو جاتا ہے جہاں شعور اور لاشعور کی سرحدیں مدھم ہو جاتی ہیں، اور وہ کسی بھی واضح تفریق کے بغیر حقیقت اور خواب کے درمیان آوارہ ہو رہا ہے۔ مصنف نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ سروپ کی ذہنی حالت اتنی بے چین اور منتشر ہو چکی ہے کہ وہ نیند کے معمولات سے باہر نکل چکا ہے، اور اس کا دماغ مسلسل متحرک ہے۔ سروپ کا ذہن مکمل طور پر بیدار نہیں بلکہ خواب اور حقیقت کے درمیان ایک نیم غنودگی کی حالت میں ہے۔ وہ ابھی پوری طرح سے بیدار ہے، لیکن اس کا دماغ ایک خوابیدہ کیفیت میں ہے۔ "کھڑکی کی طرف بڑھا اور باہر

کی طرف نکل گیا" میں سروپ کی غیر معمولی ذہنی کیفیت اور اس کی اندرونی بے چینی کی عکاسی کی گئی ہے، جیسے وہ خود کو حقیقت سے دور ایک خواب کی حالت میں محسوس کر رہا ہے۔

انسان کہیں بھی چلا جائے وہ اپنی اصل سے بھاگ نہیں سکتا وہ انسان کے ساتھ ہمیشہ رہتی ہے پھر چاہے وہ اک خواب کی صورت میں ہی کیوں ہو۔اس کہانی میں بھی یہی دکھایا گیا ہے سروپ کو اس کے خاندان نے اپنے علاقے سے برسوں دور رکھا یہاں تک کہ دوسرے ملک بھیج دیا اور وہ اپنے علاقے کی صورتحال کو ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں سکتا تھا پھر بھی اسے جو خواب آتے ہیں ان خوابوں کے پیچھے وہ بھاگتا بھاگتا پھر انہی لوگوں میں جا پہنچا جن سے اسے دور رکھا گیا تھا ۔اسی لیے تو وہ خود سے سوال کرتا ہے کہ کیا یہ سب لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں اور مجھے کیا کرنا ہے ۔یہ بلوچی لوگ ہیں جو اپنے سربراہ کے کھونے کے بعد اس کی اولاد کے انتظار میں ہیں کہ وہ آئے اور آزادی کی اس تحریک کو آگے بڑھائے اور ان لوگوں کو سہارا دے ۔ اس کی مزید ایک اور مثال ملاحظہ کریں:

> ان پُر شکم مسرتوں کے خواب دیکھنے والوں کے تیز دھار خیالات ،کینہ پرور جزبات اور مجرمانہ خواہشات کو نہ صرف جنم دیتے ہیں ۔بل کہ تم جیسوں کو سستے داموں خرید لیتے ہیں ۔تم ان خوابوں کی پرورش کرتے رہتے ہو۔انھیں پانے کے لئے تمہارے جسموں میں جان لیوا زہر سرائیت کر جاتا ہے ۔لیکن تم بے خبر ہوتے ہو اور پھر بھی تم اپنی ازلی انسانی فیاضی جاری رکھتے ہوئے اپنی اپنی چاندنیاں بچھائے اس انتظار میں کاٹ دیتے ہو کہ شاید کوئی خواب تعبیر کی صورت اختیار کرلے۔ (14)

مصنف نے اس مقام پر بلوچی لوگوں کی ذہنی اور نفسیاتی حالت، اور ان کے خوابوں، امیدوں، اور کٹھن حقیقتوں کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ مصنف اس بات کی وضاحت کرما چاہ رہا ہے کہ جب انسان یا قومیں اپنی بنیادی ضروریات یا خوشیوں کو حاصل کرنے کے خواب دیکھتے ہیں، تو ان خوابوں کے پیچھے خطرناک، پیچیدہ، اور سیاہ جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ یہاں شکم مسرتوں کے خواب کا مطلب ہے کہ لوگ وقتی خوشیوں یا کامیابیوں کے خواب دیکھتے ہیں، جو ان کی جدو جہد کا حصہ بن جاتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی یہ خواب انہیں شدید منفی اور خطرناک خواہشات کی طرف بھی لے جاتے ہیں۔تم جیسوں کو سستے داموں خرید لیتے ہیں" میں مصنف اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ معاشرتی یا سیاسی جدو جہد میں شامل افراد یا گروہ کبھی کبھار اپنی آزادی یا حقوق کے لیے اتنے مایوس ہو جاتے ہیں کہ انہیں چالبازی یا لالچ کے ذریعے قابو کیا جا سکتا ہے۔ یہ جملہ ان افراد کی بے بسی اور کمزوری کو ظاہر کرتا ہے جو اپنے خوابوں کے پیچھے اس قدر اندھے ہو جاتے

ہیں کہ وہ سستے داموں یا کم قیمتوں پر اپنی اہمیت یا خود مختاری بیچ دیتے ہیں۔ مصنف نے اس صورتحال کو بیان کیا ہے کہ یہ افراد یا گروہ اپنے خوابوں اور خواہشات کی طرف اتنی شدت سے بڑھتے ہیں کہ ان کی تگ و دو، محنت اور قربانی کا نتیجہ ایک طرح کی ذہنی یا جسمانی بیماری میں تبدیل ہو جاتا ہے، جو ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ یہاں "جان لیوا زہر" ایک استعاراتی اظہار ہے جو ان کے خوابوں کے پیچھے چھپے خطرات اور اس کا نتیجہ ظاہر کرتا ہے۔ مصنف نے ان لوگوں کی بے خبری اور امید کی عکاسی کی ہے جو اتنی شدت سے اپنے خوابوں کے پیچھے بھاگتے ہیں کہ وہ اس بات سے بے خبر ہو جاتے ہیں کہ ان کا خواب حقیقت بننے کے امکانات کم ہوتے جا رہے ہیں۔ "ازلی انسانی فیاضی" ایک ایسی امید اور حلم کا اظہار ہے جو انسان کی فطرت میں ہے، اور وہ اپنے خوابوں کے لیے مسلسل محنت کرتا رہتا ہے، چاہے اس کا خواب کبھی بھی مکمل نہ ہو سکے۔

انسانی فطرت ہے کہ وہ ساری زندگی جواب سجاتا ہے سنوارتا ہے پھر ان خوابوں کو اپنی زندگی میں انگارے بنتا دیکھتا ہے کیونکہ انسان ہمیشہ خواب وہی دیکھتا ہے جن کے پورے ہونے کے امکانات کم ہوں اور اگر پورے کر سکے گا تو انگاروں پہ لوٹنا پڑے گا ۔خواب کے تعبیر کی حسرت نسل در نسل سرائیت کر جاتی ہے ۔ انسانی تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اپنے خوابوں کے پیچھے اندھے ہو کر اپنے ارد گرد کی حقیقتوں کو نظر انداز کرتے ہیں، اور اس شدت میں وہ اکثر اپنی آزادی یا فلاح کے بدلے میں ایسے فیصلے کر لیتے ہیں جو دراصل انہیں نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان کے خوابوں کی تعبیر نہ صرف فرد کے لیے، بلکہ پورے سماج یا قوم کے لیے ایک خطرہ بن سکتی ہے، کیونکہ وہ اپنی تقدیر کو اپنے ہاتھوں سے نہیں، بلکہ لالچ، جھوٹ اور دھوکہ دہی کے ذریعے بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسی طرح ان خوابوں کے بیان میں مصنف نے ایک اور موضوع بھی اٹھایا ہے کہ ان خوابوں کو پورا کرنے لئے بہت محنت درکار ہے کہ جیسا کہ ان خوابوں کو دیکھنے والے پہلے لوگوں نے کی تھی جو اب قبروں میں جا پہنچے ہیں ۔یہاں مصنف پھر اس طرف توجہ دلواتے ہیں کہ ان قبروں والوں کو واپس آنا ہوگا مراد وہی شوق اور جزبہ ہوگا تو خواب کی تعبیر ملے گی جیسے:

> ۔۔۔۔اس کے کوٹ میں سے ہوا کے تازہ جھونکوں نے مسموم فضا میں ایک خوشگوار مہک پیدا کردی ۔قبروں میں سوئے ہوئے لوگ انگڑائیاں لیکر بیدار ہونے لگے ۔دور دور تک انسانی سروں کا ایک نیا پرجوش ہجوم نظرآنے لگا ۔ان سب کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔جن کی روشنی اس ملگجے سے اندھرے میں تاریک سے نبردآزما تھیں ۔(15)

مصنف نے ایک گہرے اور علامتی پیغام کو پیش کیا ہے، جو خوابوں کی حقیقت اور ان کے حصول کے لیے درکار محنت کو اجاگر کرتا ہے۔ "اس کے کوٹ میں سے ہوا کے تازہ جھونکوں نے مسموم فضا میں ایک خوشگوار مہک پیدا کردی" میں مصنف نے ایک متضاد حالت کی عکاسی کی ہے جہاں تیز ہوا اور خوشبو کی مہک ایک منفی یا غیر صحت مند ماحول میں محسوس ہو رہی ہے۔ یہ متضاد منظر خوابوں اور حقیقت کے درمیان تناقض کو ظاہر کرتا ہے، جس میں خوابوں کے حصول کے لیے جدو جہد ضروری ہے، مگر وہ جدو جہد کسی حد تک کٹھن اور مشکلات سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ مصنف نے ماضی کے خواب دیکھنے والوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے، یعنی وہ لوگ جو اپنی جدوجہد اور محنت کی بدولت خوابوں کی تعبیر تک پہنچنے کے قریب تھے، اب وہ موت کی گہری نیند میں سو چکے ہیں۔ یہاں "قبروں میں سوئے ہوئے لوگ" ایک علامت ہیں، جو ماضی کی قربانیوں، جدوجہد اور شوق کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مصنف نے اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ ماضی کی قربانیاں اور خواب ابھی تک زندہ ہیں، اور اب نئے لوگ، یا نئی نسل، ان خوابوں کی تعبیر کے لیے دوبارہ بیدار ہو رہی ہے۔ یہ ہجوم ایک نئی امید، جذبہ، اور عزم کی علامت ہے جو ان ماضی کے خواب دیکھنے والوں کی جدوجہد کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ یہاں "مشعلیں" ایک طاقتور علامت ہیں جو علم، روشنی اور جدوجہد کے جذبے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ مشعلوں کی روشنی ان مشکلات اور اندھیروں کے خلاف جنگ کی علامت ہے، جو ان نئے خواب دیکھنے والوں کو درپیش ہیں۔ یہ منظر اس بات کو اجاگر کرتا ہے کہ خوابوں کی تعبیر کے لیے جدوجہد اور محنت کا عمل جاری رہنا چاہیے، اور یہ روشنی کسی طور پر اس تاریکی کو دور کر کے کامیابی کی طرف لے جائے گی۔

یہاں مصنف نے قبروں میں بیدار مردوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زندہ انسانوں کو بیدار ہونے کی طرف راغب کیا ہے کیونکہ جو قومیں خواب غفلت میں مبتلا رہتی ہیں وہ حق لے لئے نہ آواز اٹھاتی ہیں اور نہ ہی کوئی جدو جہد کرتی ہیں ۔اس لیے ذہنی طور پر قوم کو بیدار ہونے کر ضرورت ہے تاکہ اپنا حق حاصل کر سکیں ۔

اسلوب کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس ناول کا پلاٹ بہت مضبوط ہے کہانی میں جان ہے ،کردار متحرک ہیں اور قاری کو ہر طرح سے مصنف نے کہانی میں ضم کرنے کی کوشش کی ہے ۔ نعیم بیگ نے اپنے ناول میں آغاز سے اختتام تک اسلوب کی خوبی کو بہترین طریقے سے ظاہر کیا ہے، اور تاریخی و سیاسی پروپیگنڈے کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے، جس سے کہانی کا اثر اور جاذبیت بڑھ گئی ہے۔ ناول میں ایک مکمل ماحول تخلیق کیا گیا، جس میں کردار بولتے، چلتے پھرتے، لڑتے اور قربان ہوتے ہوئے نظر آئے۔قاری اس ماحول میں ایسے محو ہوا جیسے کوئی فلم آنکھوں کے سامنے چل رہی ہو اور بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوا کہ شاید قاری بھی اسی کہانی کا ہی کوئی کردار یا پہلو ہے۔

اس کہانی میں ایک کردار سروپ کو بلوچ خاندان کے لوگ اپنے گھر اور علاقے سے دور بھیج دیتے ہیں لیکن ایسا کہاں ہوتا ہے انسان جس چیز کی منصوبہ بندی کرے اور وہی پوری ہو جائے آگے چل کے یہی لڑکا بلوچوں کی تحریک آزادی کو آگے بڑھاتا ہے اور اس میں پیش پیش رہتا ہے ۔لیکن والدین کی محبت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اس ہیبت ناک ماحول سے دور رہے اور اپنا مستقبل بنائے یہاں بھی والدین کی اپنی اولاد سے محبت دکھائی گئی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے جب سروپ اپنے علاقے میں واپس آتا ہے تو اپنے علاقے کے حالات کو دیکھ کر اپنے مستقبل کی فکر چھوڑ کر اس کی ترقی اور یہاں کے لوگوں کے لئے کام میں لگ جاتا ہے ۔اس کے اندر بھی اسی شہناز بلوچ کا ہی خون دوڑ رہا ہوتا ہے جس نے اپنے علاقے کی ترقی کی جدو جہد میں جان تک قربان کر دی تھی ۔بھلا خون کا اثر کیوں کر نہ ہوتا۔یہی جذبہ صبا کے اندر بھی آخر تک برقرار تھا جب تک اس کے اندر جان رہی ۔نعیم بیگ نے ان کرداروں کی ان قربانیوں کو پیش کرتے ہوئے بلوچستان کے علاقے کے لوگوں کے جزبات سوچ فکر اور یہاں کیسے اپنے علاقے کے لئے لوگ ہر وقت تگ ودو میں رہتے ہیں کو موضوع بنایا ہے ۔مصنف نے اپنے چند کرداروں کو ساتھ لے کر یہ سب بہت عمدہ انداز میں پیش کیا ہے ۔علاقوں کی تاریخ اور پھر وہاں کے لوگوں کا رہن سہن وغیرہ جیسے موضوعات اردو ناول میں عام مل جاتے ہیں لیکن اس طرح کا طرز بیان کم خال خال ہی ہے ۔ ناول کی کہانی میں جان ہے یہ کہانی قاری کو زور سے اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی ہے ۔خواب انگارے ایک ایسا ناول ہے جو تاریخی، ثقافتی، اور سیاسی پس منظر کو بڑی خوبی سے پیش کرتا ہے۔

اس میں مصنف نے نہ صرف کرداروں کی ذہنی اور جذباتی حالتوں کو بیان کیا ہے بلکہ ان کی قربانیوں، جدوجہد، اور خوابوں کی حقیقت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ناول میں خوابوں کی تعبیر کے لیے درکار محنت اور قربانیوں کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے، خاص طور پر جب مصنف ماضی کی قربانیوں اور موجودہ خواب دیکھنے والوں کے درمیان ربط قائم کرتا ہے۔اس میں کرداروں کا کردار صرف کہانی کے حصے نہیں ہیں بلکہ وہ اس ماحول کے اندر جیتے ہیں، چلتے ہیں، لڑتے ہیں اور قربان ہوتے ہیں۔ مصنف نے اپنے اسلوب میں تاریخی اور سیاسی پروپیگنڈے کو اس قدر خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ وہ کہانی کے فطری حصے کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ ناول میں "مشعلوں" کے ذریعے ایک نئی روشنی کی امید ظاہر کی گئی ہے، جو خوابوں کی تعبیر کے لیے راہ دکھاتی ہے۔ اس ناول میں مصنف نے کرداروں کی روحانیت، آزادی کی جدو جہد، اور ان کے خوابوں کو انتہائی دلچسپ اور متاثر کن انداز میں پیش کیا ہے، جس سے یہ کہانی نہ صرف قاری کو متوجہ کرتی ہے بلکہ ایک گہری سوچ کی دعوت بھی دیتی ہے۔

حوالہ جات

1. عظیم الشان صدیقی ،"اردو ناول -آغازو ارتقا 1857سے 1914تک"ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی،2008،ص28
2. ڈاکٹر ،علی احمد فاطمی،"تاریخی ناول فن اور اصول",تہزیب نو پبلی کیشنز،الہ آباد انڈیا،1980،ص9
3. نعیم بیگ ,"خواب انگارے ",عکس پبلی کیشنز ،لاہور،2022،ص10
4. نعیم بیگ ,"خواب انگارے ",عکس پبلی کیشنز ،لاہور،2022،ص53
5. نعیم بیگ ,"خواب انگارے ",عکس پبلی کیشنز ،لاہور،2022،ص27
6. نعیم بیگ ,"خواب انگارے ",عکس پبلی کیشنز ،لاہور،2022،ص99
7. نعیم بیگ ,"خواب انگارے ",عکس پبلی کیشنز ،لاہور،2022،ص،98
8. نعیم بیگ ,"خواب انگارے ",عکس پبلی کیشنز ،لاہور،2022،ص99-98
9. نعیم بیگ ,"خواب انگارے ",عکس پبلی کیشنز ،لاہور،2022،ص100
10. نعیم بیگ ,"خواب انگارے ",عکس پبلی کیشنز ،لاہور،2022،ص،87
11. نعیم بیگ ,"خواب انگارے ",عکس پبلی کیشنز ،لاہور،2022،ص88
12. نعیم بیگ ,"خواب انگارے ",عکس پبلی کیشنز ،لاہور،2022،ص68
13. نعیم بیگ ,"خواب انگارے ",عکس پبلی کیشنز ،لاہور،2022،ص73
14. نعیم بیگ ,"خواب انگارے ",عکس پبلی کیشنز ،لاہور،2022،ص75
15. نعیم بیگ ,"خواب انگارے ",عکس پبلی کیشنز ،لاہور،2022،ص76